راجہ نے نادم ہو کر کہا۔ ''ایسا ہی ضروری کام تھا۔ ایک دن کی بھی دیر ہو جاتی تو علاقہ میں فوجداری ہو جاتی۔ مجھے اب تجربہ ہو رہا ہے کہ تعلقداروں کے اپنے علاقہ جات میں نہ رہنے سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔''

اندو: علاقہ میں رہتے تو کم سے کن اتنی بدنامی تو نہ ہوتی۔

راجہ صاحب: اچھا تمہیں بھی معلوم ہو گیا۔ تمہارا کہنا نہ مانا۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اس اندھے نے ایسے مخمصے میں ڈال دیا ہے کہ کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتا۔ سارے شہر میں بدنام کر رہا ہے۔ نہ جانے شہر کے باشندوں کو اس سے اتنی ہمدردی کیسے ہو گئی۔ مجھے مطلقاً گمان نہ تھا کہ یہ شہر والوں کو میری مخالفت پر آمادہ کرے گا۔

اندو: میں نے تو جب سے سنا ہے کہ اندھا تمہیں بدنام کر رہا ہے تب سے ایسا غصہ آ رہا ہے کہ میرا بس چلے تو اسے زندہ درگور کر دوں۔

راجہ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ ''تو ہم دونوں گھوم گھام کر ایک ہی جگہ آ پہنچے۔''

اندو: اس بدمعاش کو ایسی سزا دینی چاہیے کہ عمر بھر یاد کرے۔

راجہ صاحب: مسٹر کلارک نے اس کا فیصلہ خود ہی کر دیا۔ سورداس کی زمین واپس کر دی گئی۔

اندو کو ایسا معلوم ہوا کہ پیروں تلے کی زمین دھنس رہی ہے اور اس کے ساتھ وہ بھی۔ وہ دیوار کا سہارا نہ لیتی تو یقیناً گر پڑتی۔ صوفیہ نے مجھے اس طرح ذلیل کیا ہے۔ میرے ساتھ یہ چال چلی ہے۔ ہماری عزت کو خاک میں ملانا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے قدم چوموں۔ یہ ہرگز نہ ہوگا۔

اندو نے راجہ صاحب سے کہا۔ ''اب آپ کیا کریں گے؟''

راجہ صاحب: کچھ نہیں۔ کرنا کیا ہے؟ سچ پوچھو تو مجھ کو اس کا ذرا بھی ملال نہیں۔ میری تو گلو خلاصی ہو گئی۔

اندو: اور سبکی کتنی ہوئی۔

راجہ صاحب: سبکی ضرور ہوئی مگر اس بدنامی سے بہتر ہے۔

اندو کا چہرہ غرور سے تمتما اٹھا۔ بولی۔ ''یہ بات آپ کے لیے زیبا نہیں۔ یہاں نیک نامی یا بدنامی کا سوال نہیں ہے بلکہ اپنے وقار کو قائم رکھنے کا سوال ہے۔ آپ کے خاندانی وقار پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اس کی حفاظت کرنا آپ کا خاص فرض ہے۔ خواہ اس کے لیے عدل و انصاف کے اصولوں کا گلا ہی کیوں نہ گھونٹنا پڑے۔ مسٹر کلارک کی ہستی ہی کیا ہے۔ میں کسی شاہنشاہ کے ہاتھوں سے بھی اپنے وقار کی بربادی نہ ہونے دوں گی۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنا سب کچھ حتیٰ کہ جان بھی دے دینی پڑے۔ آپ جلد ہی گورنر کو مسٹر کلارک کی نامنصفانہ مداخلت کی اطلاع دیجیے۔ ہمارے بزرگوں نے اس وقت انگریزوں کی حفاظت کی تھی جب ان کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ ان احسانات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ نہیں تو آپ خود ہی جا کر گورنر سے ملیے۔ ان سے کہیے کہ مسٹر کلارک کے دخل در معقولات سے میری سراسر توہین ہوگی۔ میں عوام کی نگاہوں میں ذلیل ہو جاؤں گا اور تعلیم یافتہ جماعت کو گورنمنٹ پر ذرا بھی اعتبار نہ رہے گا۔ آپ دکھلا دیں کہ رئیس کی توہین کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔''

راجہ صاحب نے تشویش ناک لہجہ میں کہا۔ ''مسٹر کلارک سے ہمیشہ کے لیے دشمنی ہو جائے گی۔ مجھے امید نہیں ہے کہ ان کے مقابلہ میں گورنر میرا ساتھ دے۔ تم ان لوگوں کو جانتی نہیں ہو۔ ان کی افسری یا ماتحتی محض دکھانے کے لیے ہے۔ اصل میں سبھی ایک ہیں۔ ایک جو کرتا ہے۔ سب اس کی تائید کرتے ہیں۔ اب آگے بڑھنا بے فائدہ پریشان ہونا ہے۔''

اندو: اگر گورنر نہ سنے تو گورنر جنرل کے یہاں اپیل کیجیے۔ ولایت جا کر وہاں کے لیڈروں سے ملیے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آپ کے سر پر ایک اہم ترین ذمہ داری کا بار آ پڑا ہے۔ اس میں ذرہ برابر دبنا آپ کی دائمی ذلت و رسوائی کا باعث ہو

گا۔

راجہ صاحب نے ایک منٹ تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''تمہیں یہاں کے تعلیم یافتہ لوگوں کا حال معلوم نہیں ہے۔ تم سمجھتی ہو گی کہ وہ میری مدد کریں گے یا کم از کم ہمدردی کا اظہار ہی کریں گے، لیکن جس دن میں نے کھلے الفاظ میں مسٹر کلارک کی شکایت کی، اسی دن سے لوگ میرے گھر آنا جانا بھی بند کر دیں گے۔ کوئی منہ تک نہ دکھائے گا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مسٹر کلارک سے میری خفیہ شکایتیں کریں گے اور مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ ہمارے خواندہ اور مہذب بھائیوں کی اخلاقی کمزوری ناگفتہ بہ ہے۔ سب کے سب ظاہر یا پوشیدہ طریقہ پر گورنمنٹ کے دست نگر ہیں۔ جب تک انہیں معلوم ہے کہ حکام سے میرا ربط ضبط ہے جبھی تک میری عزت اور قدر کرتے ہیں۔ جس روز انہیں معلوم ہو گا کہ حاکم ضلع کی نگاہ مجھ سے پھر گئی، اسی روز سے میرے اعزاز کا خاتمہ سمجھو۔ ہمارے بھائیوں کی یہی کمزوری اور خودغرضی ہے جو ہمارے لیے بے خوف راست گو اور جری رہنمایان ملک کے حوصلے پست کر دیتی ہے۔''

راجہ صاحب نے لطائف الحیل سے خوب کام لیا اور حالات گردوپیش کا نہایت یاس انگیز نقشہ کھینچا، لیکن اندوا اپنے نقطہ سے جو بھر بھی نہ ٹلی۔ وہ ان کے دل میں اس جذبہ کو بیدار کرنا چاہتی تھی جو کبھی پرتاپ اور سانگا، ٹیپو اور نانا کے ناموں پر قربان ہو جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جذبہ مرا نہیں بلکہ اس پر اقتدار کی محبت کی نیند کا غلبہ ہے۔ بولی۔ ''اگر مان لیں کہ آپ کے سارے اندیشے ٹھیک نکلیں۔ آپ کی عزت مٹ جائے۔ سارا شہر آپ کا دشمن ہو جائے۔ حکام آپ کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ یہاں تک کہ آپ کے علاقہ کے ضبط ہونے کی بھی نوبت آ جائے۔ جب بھی میں آپ سے یہ یہی کہتی جاؤں گی کہ اپنی جگہ پر اٹل رہیے۔ ہم چھتریوں کا یہی دھرم ہے۔ آج ہی اخباروں میں یہ بات شائع ہو جائے گی اور ساری دنیا نہیں تو کم از کم

سارا ملک آپ کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھے گا کہ آپ اس قومی وقار کی کتنی مردانگی اور آزادی سے حفاظت کرتے ہیں۔ اس جنگ میں ہماری شکست بھی ایک عظیم فتح خیال کی جائے گی کیونکہ یہ جنگ مادی نہیں روحانی ہے، لیکن مجھے تو یقین کامل ہے کہ آپ کے اندیشے باطل ثابت ہوں گے۔ ایک حاکم کی زیادتی کی فریاد سرکار کے کانوں تک پہنچا کر آپ اس زبردست وفاداری کا ثبوت دیں گے۔ سرکار کی عدل گستری پر اس اعتماد کامل کا اعلان کریں گے جو سلطنت کی مضبوطی کی بنیاد ہے۔ بچہ ماں کے سامنے روئے، مچلے، ہٹ کرے۔ پر ماں کی محبت ذرا بھی کم نہیں ہوتی۔ مجھے تو یقین ہے کہ سرکار اپنے انصاف کی دھاک جمانے کے لیے آپ کی اور بھی عزت کرے گی۔ قومی تحریکات کے رہنماؤں کو عموماً اونچے اونچے خطابات دیئے جاتے ہیں۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو بھی وہی اعزاز حاصل نہ ہو۔''

یہ دلیل راجہ صاحب کو غور کرنے کے لیے قابل معلوم ہوئی۔ بولے۔ ''اچھا سوچوں گا۔'' اتنا کہہ کر باہر چلے گئے۔

دوسرے روز صبح مسٹر جان سیوک راجہ صاحب سے ملنے آئے۔ انہوں نے بھی یہی صلاح دی کہ اس معاملہ میں ذرا بھی نہ دبنا چاہیے۔ لڑوں گا تو میں۔ آپ صرف میری مدد کرتے جایئے گا۔ راجہ صاحب کو کچھ تسکین ہوئی۔ ایک سے دو ہوئے۔ شام کے وقت وہ کنور صاحب سے صلاح لینے گئے۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی۔ ڈاکٹر گنگولی کو تار دے کر بلایا گیا۔ انہوں نے یہاں تک کہا کہ آپ خاموش بھی ہو جائیں گے تو میں کونسل میں اس معاملہ کو ضرور پیش کروں گا۔ سرکار ہمارے تجارتی معاملات کی طرف سے اس قدر بے پروا نہیں ہوسکتی۔ یہ انصاف یا بے انصافی، عزت یا بے عزتی کا سوال نہیں ہے۔ صرف تجارتی معاملہ کا سوال ہے۔''

راجہ صاحب اندو سے بولے۔ ''لو بھئی۔ تمہاری صلاح ٹھیک رہی۔ جان پر کھیل رہا ہوں۔''

اندو نے انہیں عقیدت مند نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''ایشور نے چاہا تو آپ کی فتح ہوگی۔''

(22)

سید طاہر علی کو امید کامل تھی کہ سگریٹ کا کارخانہ تعمیر ہونا شروع ہو جائے گا تو میری کچھ نہ کچھ ترقی ضرور ہوگی۔ مسٹر سیوک نے ان سے اس امر کا وعدہ کیا تھا۔ اس امید کے سوا انہیں اب ان قرضہ جات کے ادا کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہ نظر آتا تھا جو روز بروز برساتی گھاس کی طرح بڑھتے چلے جاتے تھے۔ وہ خود بڑی کفایت سے بسر کرتے تھے۔ عید کے دن کے علاوہ اور شاید کسی روز بھی دودھ ان کے حلق میں نہ جاتا تھا۔ مٹھائی ان کے لیے حرام تھی۔ پان تمباکو کا انہیں شوق ہی نہ تھا، لیکن یہ خود چاہے کتنی ہی کفایت کریں، گھر والوں کی ضروریات میں قطع و برید کرنا انصاف کے خلاف سمجھتے تھے۔ زینب اور رقیہ اپنے لڑکوں کے لیے دودھ لینا ضروری خیال کرتی تھیں۔ کہتیں یہی تو لڑکوں کے کھانے پینے کی عمر ہے۔ اسی عمر میں تو ان کی ہڈیاں چوڑی چکلی ہوتی ہیں۔ ان کے دل اور دماغ بڑھتے ہیں۔ اس عمر میں لڑکوں کو مقوی غذا نہ ملے تو ان کی ساری عمر ہی برباد ہو جاتی ہے۔

لڑکوں کے بارے میں ایسا کہنا سچ یا جھوٹ، مگر پان تمباکو کے بارے میں طاہر علی کی سوتیلی مائیں جس دلیل کو پیش کرتی تھیں، اس کی سچائی مسلمہ تھی۔ عورتوں کا ان کے بغیر گزر ہی نہیں ہو سکتا۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے۔ کیا ان کے یہاں پان تک میسر نہیں۔ یہی تو اب شرافت کی ایک نشانی رہ گئی ہے۔ مامائیں نہیں۔ خواصیں نہیں۔ تو کیا پان تمباکو سے بھی گئے۔ مردوں کو پان کی ایسی ضرورت نہیں۔ انہیں حکام سے ملنا جلنا پڑتا ہے۔ پرائی تابعداری کرتے ہیں۔ انہیں پان کی کیا ضرورت۔

مصیبت یہ تھی کہ ماہر اور جابر تو مٹھائیاں کھا کر اوپر سے دودھ پیتے اور صابر اور نسیمہ کھڑے منہ تاکا کرتے۔ زینب بیگم کہتیں، ان کے گڑ کے باپ کو تو ہی خدا کے

فضل سے زندہ ہیں۔ سب کو دکھا کر کھلائیں۔ جبھی کھلانا کہلائے۔ سب کچھ تو انہیں کی مٹھی میں ہے۔ چاہیں کھلائیں۔ جسے چاہیں رکھیں۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا ہے؟

وہ دونوں دن بھر بکری کی طرح پان چبایا کرتیں۔ کلثوم کا کھانے کے بعد ایک بیڑا بمشکل ملتا تھا۔ اپنی ان ضروریات کے لیے طاہر علی سے پوچھنے یا چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے کی ضرورت نہ تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ چمڑے کی خرید ہو رہی تھی۔ سینکڑوں چمار بیٹھے چلم پی رہے تھے۔ یہی ایک وقت تھا جب طاہر علی کو اپنے عہدہ کی اہمیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس وقت انہیں اس احساس کی وجہ سے حکومت کا خفیف سا نشہ ہو جاتا تھا۔ ایک چمار دروازہ پر جھاڑو لگاتا۔ ایک ان کا تخت صاف کرتا۔ ایک پانی بھرتا۔ کسی کو سبزی خریدنے کے لیے بازار بھیج دیتے اور زینب اور رقیہ پردہ کی آڑ میں بیٹھ کر پاندان کا خرچ وصول کرتیں۔ صاحب نے طاہر علی کو دستوری لینے سے منع کیا تھا۔ عورتوں کو پان پتے کا خرچ لینے کی ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اس آمدنی سے دونوں نے اپنے اپنے لیے زیور بنوا لیے تھے۔ طاہر علی اس رقم کا حساب لینا چھوٹی بات سمجھتے تھے۔

اسی وقت جگدھر آ کر بولا۔ ''منشی جی حساب کب تک چکتا کیجیے گا؟ میں کوئی لکھ پتی تھوڑا ہی ہوں کہ روز مٹھائیاں دیتا جاؤں، چاہے دام ملیں یا نہ ملیں۔ آپ جیسے دو چار گاہک اور مل جائیں تو میرا دوالہ ہی نکل جائے۔ لائیے۔ روپے دلوائیے۔ اب حیلہ حوالہ نہ کیجیے۔ گاؤں محلّہ کی بہت مروت کر چکا۔ میرے اوپر بھی تو مہاجن کا لہنا تگادا (تقاضا) ہے۔ یہ دیکھئے کاگد (کاغذ) حساب کر دیجیے گا۔''

باقی داروں کے لیے حساب کا کاغذ موت کا پروانہ ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ حساب دیکھنے کا مطلب ہے، روپے ادا کرنا۔ باقی دار نے حساب کا چٹھا ہاتھ میں لیا اور پانے والے کا دل امید سے شگفتہ ہو گیا۔ حساب کی فرد ہاتھ میں لے کر پھر کوئی حیلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے کہ باقی داروں کو خالی ہاتھ

حساب دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

طاہر علی نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''بھئی حساب سب معلوم ہے۔ اب بہت جلد تمہارا بقایا صاف ہو جائے گا۔ دو چار روز اور صبر کرو۔''

جگدھر: کہاں تک صبر کروں صاحب! دو چار دن کرتے کرتے تو مہینوں ہو گئے۔ مٹھائیاں کھاتے وقت تو میٹھی جان پڑتی ہیں۔ دام دیتے کیوں کڑوا لگتا ہے۔

طاہر: برادر آج کل ذرا تنگ ہو گیا ہوں۔ مگر اب جلد ہی کارکانہ کا کام شروع ہو گا۔ میری بھی ترقی ہو گی۔ بس تمہاری کوڑی کوڑی چکا دوں گا۔

جگدھر: نا صاحب۔ آج تو میں روپے لے کر ہی جاؤں گا۔ مہاجن کے روپے نہ دوں گا تو آج مجھے چھٹانک بھر بھی سودا نہ ملے گا۔ بھگوان جانتے ہیں جو میرے گھر میں ٹکا بھی ہو۔ یہ سمجھئے کہ آپ میرا نہیں، اپنا دے رہے ہیں۔ آپ سے جھوٹ بولتا ہوں تو جوانی کام نہ آئے۔ رات بال بچے بھوکے ہی سو رہے۔ سارے محلّہ میں آواز لگائی کسی نے چار آنے پیسے بھی نہ دیئے۔

چماروں کے چودھری کو جگدھر پر رحم آ گیا۔ طاہر علی سے بولا۔ ''منشی جی میرا پاونا (یا فتنی) انہیں کو دے دیجیے۔ مجھے دو چار دن پیچھے دے دیجیے گا۔''

طاہر: جگدھر میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ خدا کے لیے دو چار دن ٹھہر جاؤ۔

جگدھر: منشی جی جھوٹ بولنا گائے کھانا ہے۔ مہاجن کے روپے آج نہ پہنچے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔

طاہر علی نے گھر میں آ کر کلثوم سے کہا۔ ''مٹھائی والا سر پر سوار ہے۔ کسی طرح ٹلتا نہیں۔ کیا کروں؟ تحویل میں سے دس روپے نکال کر دے دوں؟''

کلثوم نے چڑ کر کہا۔ ''جس کے دام آتے ہیں وہ سر پر سوار ہو گا ہی۔ اماں جان سے کیوں نہیں مانگتے۔ میرے بچوں کو تو مٹھائی ملی نہیں۔ جنہوں نے کود کود کر کھایا

کھلایا ہے، وہ دام دینے کے وقت کیوں بھیگی بلی بنی بیٹھی ہوئی ہیں؟''

طاہر: اسی وجہ سے تو میں تم سے کوئی بات کہتا نہیں۔ تحویل سے لے لینے میں کیا ہرج ہے؟ تنخواہ ملتے ہی جمع کر دوں گا۔

کلثوم: خدا کے لیے کہیں یہ غضب نہ کرنا۔ روکڑ کو کالا سانپ سمجھو۔ کہیں آج ہی صاحب رقم کی جانچ کرنے لگے تو؟

طاہر: اجی نہیں۔ صاحب کو اتنی فرصت کہاں کہ روکڑ ملاتے رہیں۔

کلثوم: میں امانت کی رقم چھونے کو نہ کہوں گی۔ ایسا ہی ہے تو نسیمہ کا طوق اتار کر کہیں گرو رکھ دو۔ اور تو میرے کیے کچھ نہیں ہو سکتا۔

طاہر علی کو رنج تو بہت ہوا مگر کیا کرتے۔ نسیمہ کا طوق اتارتے تھے اور روتے تھے۔ کلثوم اسے پیار کرتی تھی اور پھسلا کر کہتی تھی۔ ''تمہارا نیا طوق بنوانے جا رہے ہیں۔'' نسیمہ پھولی نہ سماتی تھی کہ مجھے نیا طوق ملے گا۔

طوق کو رومال میں لیے ہوئے طاہر علی باہر نکلے اور جگدھر کو علیحدہ لے جا کر بولے۔ ''بھئی اسے لے جاؤ۔ کہیں گرو رکھ کر اپنا کام چلاؤ۔ گھر میں روپے نہیں ہیں۔''

جگدھر: ادھار سودا دینا پاپ ہے، پر کروں کیا۔ نکد (نقد) بیچنے لگوں تو گھومتا ہی رہ جاؤں۔

یہ کہہ کر اس نے ذرا تامل کرتے ہوئے طوق لے لیا اور پچھتاتا ہوا چلا گیا۔ کوئی دوسرا آدمی اپنے گاہک کو اتنا دق کر کے روپے نہ وصول کرتا۔ اسے لڑکی پر رحم آ ہی جاتا جو مسکرا کر کہہ رہی تھی کہ میرا طوق کب بنا کر لاؤ گے۔ لیکن جگدھر اخراجات خانگی کے ناقابل برداشت بار کے سبب اس سے کہیں زیادہ بے مروت بننے پر مجبور تھا جتنا کہ وہ واقعی تھا۔

جگدھر کو گئے ہوئے نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ بجرنگی تیور بدلے ہوئے آ کر

بولا۔ ''منشی جی روپے دینے ہوں تو دیجیے۔نہیں کہہ دیجیے، بابا ہم سے نہیں ہوسکتا۔ بس ہم صبر کرلیں۔ سمجھ لیں گے کہ ایک گائے نہیں لگی۔ روز بروز دوڑاتے کیوں ہو؟''

طاہر: برادر۔ جیسے اتنے دنوں تک صبر کیا ہے۔تھوڑے دنوں تک اور صبر کرو۔ خدا نے چاہا تو اب کے تمہاری ایک پائی بھی نہ رہے گی۔

بجرنگی: ایسے وعدے تو آپ بیسوں بار کر چکے ہیں۔

طاہر: اب کے پکا وعدہ کرتا ہوں۔

بجرنگی: تو کس دن حساب کیجیے گا۔

طاہر علی مخمصے میں پڑ گئے۔کون سا دن بتلائیں۔ باقی داروں کو حساب کے دن کا اتنا ہی خوف ہوتا ہے جتنا گناہگاروں کو۔وہ ''دو چار'' ''بہت جلد'' ''آج دل میں'' وغیرہ وغیرہ مبہم الفاظ کا سہارا لیا کرتے ہیں۔اپنے وعدے پورے کیے جانے کے لیے نہیں، صرف پانے والوں کو ٹالنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ طاہر علی طبعاً خوش معاملہ شخص تھے۔تقاضوں سے انہیں سخت پریشانی ہوتی تھی۔وہ تقاضوں سے اتنا ہی ڈرتے تھے جتنا شیطان سے۔انہیں دور سے دیکھتے ہی ان کی روح فنا ہو جاتی تھی۔ خیر کئی منٹ تک سوچتے رہے۔کیا جواب دوں۔خرچ کا یہ حال ہے اور ترقی کے لیے کہتا ہوں تو کورا جواب ملتا ہے۔آخر بولے۔''دن کون سا بتاؤں۔چار چھ دن میں جب آ جاؤ گے، اسی دن حساب ہو جائے گا۔''

بجرنگی: منشی جی۔مجھ سے اڑن گھاٹیاں نہ بتائیے۔ مجھے بھی سبھی طرح کے گاہکوں سے کام پڑتا ہے۔اگر دس دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے، اتنی دیر کیوں کی۔اب روپے خرچ ہو گئے۔اگر چار پانچ دن میں آؤں گا تو آپ کہیں گے، ابھی تو روپے ملے ہی نہیں۔اس لیے مجھے کوئی دن بتا دیجیے جس میں میرا بھی ہرج نہ ہو اور آپ کو بھی سبھیتا ہو۔

طاہر: دن بتا دینے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوتا مگر بات یہ ہے کہ میری تنخواہ ملنے کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ دو چار دنوں کا ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔ ایک ہفتہ بعد کسی لڑکے بھی بھیج دو گے تو روپے مل جائیں گے۔

بجرنگی: اچھی بات ہے آپ ہی کا کہنا سہی۔ اگر اب کی بھی وعدہ پورا نہ کیجیے گا تو پھر مانگنے نہ آؤں گا۔

بجرنگی چلا گیا تو طاہر علی بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے لگے۔ تم لوگ سمجھتے ہو گے، یہ لوگ اتنی اتنی طلب پاتے ہیں، گھر میں بٹور کر رکھتے ہوں گے اور یہاں خرچ کا یہ حال ہے کہ آدھا مہینے بھی نہیں ختم ہونے پاتا کہ روپے اڑ جاتے ہیں۔ شرافت روگ ہے اور کچھ نہیں۔

ایک چمار نے کہا۔ ''ہجور بڑے آدمیوں کا کھرچ بھی بڑا ہوتا ہے۔ آپ ہی لوگوں کی بدولت تو گریبوں کی گجر ہوتی ہے۔ گھوڑے کی لات گھوڑا ہی سہہ سکتا ہے۔''

طاہر: اجی صرف پان میں اتنا خرچ ہو جاتا ہے کہ اتنے میں دو آدمیوں کا بخوبی گزر ہو سکتا ہے۔

چمار: ہجور۔ دیکھتے نہیں ہیں کیا۔ بڑے آدمیوں کی بڑی بات ہوتی ہے۔

ابھی طاہر علی کی اشک شوئی کافی طور پر نہ ہونے پائی تھی کہ سامنے سے ٹھاکر دین آتا ہوا دکھائی دیا۔ بچارے پہلے ہی سے کوئی بہانہ سوچنے لگے۔ اتنے میں اس نے آ کر سلام کیا اور بولا۔ ''منشی جی۔ کارخانہ میں کب سے ہاتھ لگے گا؟''

طاہر: مسالہ جمع ہو رہا ہے۔ ابھی انجینئر نے نقشہ نہیں بنایا۔ اسی وجہ سے دیر ہو رہی ہے۔

ٹھاکر دین: انجینئر نے بھی کچھ لیا ہو گا؟ بڑی بے ایمان جات ہے۔ ہجور میں نے بھی کچھ ٹھیکہ داری کی ہے۔ جو مانگتا تھا انجینئر کو کھلا دیتا تھا۔ آخر گھبرا کر چھوڑ بیٹھا۔

انجینئر کے بھائی ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ روگی چاہے مرتا ہو پر فیس لیے بنا بات نہ سنیں گے۔ فیس کے نام سے رعایت بھی کریں گے تو گاڑی کے کرایہ اور دوا کے دام میں کس لیں گے۔ (حساب کی فرد دکھا کر) جرا (ذرا) ادھر بھی ایک نجر (نظر) ہو جائے۔

طاہر: سب معلوم ہے۔ تم نے غلط تھوڑا ہی لکھا ہوگا۔

ٹھاکر دین: ہجور ایمان ہے تو سب کچھ ہے۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا۔ تو مجھے کیا حکم ہوتا ہے؟

طاہر: دو چار روز کی مہلت دو۔

ٹھاکر دین: جیسی آپ کی مرضی ہجور۔ چوری ہو جانے سے لاچار ہو گیا۔ نہیں تو دو چار روپیوں کی کون بات تھی۔ اس چوری میں تباہ ہو گیا۔ گھر میں پھوٹا لوٹا تک نہ بچا۔ دانے دانے کو محتاج ہو گیا ہجور۔ چوروں کو آنکھوں کے سامنے بھاگتے دیکھا۔ ان کے پیچھے دوڑا پاگل خانہ تک دوڑتا چلا گیا۔ اندھیری رات تھی۔ اونچا کھائی کچھ نہ سوجھتا تھا۔ ایک گڑھے میں گر پڑا۔ پھر اٹھا۔ مال بڑا پیارا ہوتا ہے۔ لیکن چور نکل گئے تھے۔ تھانہ میں رپٹ کی۔ تھانہ داروں کی کھوسامد کی۔ پر گئی ہوئی کچھی کہاں لوٹتی ہے۔ تو کب آؤں؟

طاہر: تمہارے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بجھوا دوں گا۔

ٹھاکر دین: جیسی آپ کی کھسی۔ مجھے کوئی اجر نہیں ہے۔ مجھے تگادا (تقاضا) کرتے آپ ہی شرم آتی ہے۔ کوئی بھلا مانس ہاتھ میں پیسے رہتے ہوئے ٹال مٹول نہیں کرتا۔ فوراً نکال کر پھینک دیتا ہے۔ آج جرا پان لینے جانا تھا اس لیے چلا آیا تھا۔ سب نہ ہو سکے تو تھوڑا بہت دے دیجیے۔ کسی طرح کام نہ چلا تب آپ کے پاس آیا۔ آدمی پہچانتا ہوں ہجور۔ پر موکا (موقع) ایسا ہی آپڑا ہے۔

ٹھاکر دین کی منکسر مزاجی اور شگفتہ خاطری نے طاہر علی کو گرویدہ بنا لیا۔ فوراً

صندوق کھولا اور پانچ روپے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔ ٹھاکر دین نے روپے اٹھائے نہیں۔ وہ ایک لمحہ تک سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یہ آپ کے روپے ہیں کہ سرکاری روکڑ ہیں؟''

طاہر: تم لے جاؤ۔ تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے کہ پیڑ گننے سے۔

ٹھاکر دین: نہیں منشی جی۔ یہ نہ ہوگا۔ اپنے روپے ہوں تو دیجیے مالک کی روکڑ ہو تو رہنے دیجیے۔ پھر آ کر لے جاؤں گا۔ آپ کے چار پیسے کھاتا ہوں تو آپ کو آنکھوں سے دیکھ کر گڑھے میں نہ گرنے دوں گا۔ برا مانیے تو مان جائیے۔ اس کی چنتا نہیں۔ صفابات کہنے کے لیے بدنام ہوں۔ آپ نے روپے یوں اللے تللے کھرچے ہوں گے تو ایک دن آپ دھوکا کھائیں گے۔ بھل منسی تو ٹھاٹ باٹ بڑھانے میں نہیں ہے۔ اپنی آبرو بچانے میں ہے۔

طاہر علی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''روپے لیتے جاؤ۔''

ٹھاکر دین اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''جب آپ کے پاس ہوں تب دینا۔''

اب تک تو طاہر علی کو کارکانہ کے بننے کی امید تھی کہ ادھر آمدنی بڑھی اور ادھر میں نے روپے دیئے، لیکن جب مسٹر کلارک کے نئے حکم کے بموجب تعمیر کا کام غیر معینہ مدت کے لے بند کر دیا گیا تو طاہر علی کو اپنے مہاجنوں کو سمجھانا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے زیادہ تنگ کرنا شروع کیا۔ طاہر علی بہت متفکر رہنے لگے۔ عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کلثوم کہتی تھی اوپر کا خرچ سب بند کر دیا جائے۔ دودھ پان اور مٹھائیوں کے بغیر آدمیوں کو کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ ایسے کتنے آدمی ہیں جنہیں اس زمانہ میں یہ چیزیں میسر ہیں؟ اوروں کی کیا کہوں۔ میرے ہی لڑکے ترستے ہیں۔ میں پہلے ہی سمجھا چکی ہوں اور اب پھر سمجھاتی ہوں کہ جن کے لیے تم اپنا لہو پسینہ ایک کر رہے ہو وہ تمہاری بات بھی نہ پوچھیں گے۔ پر نکلتے ہی صاف اڑ نہ جائیں تو کہنا۔ ابھی سے رخ دیکھ رہی ہوں۔ اوروں کو سود پر روپے دیئے جاتے ہیں۔ زیور بنوائے جاتے

ہیں، لیکن گھر کے خرچ کو کبھی کچھ مانگو تو ٹکا سا جواب ملتا ہے کہ میرے پاس کہاں۔ تمہارے اوپر انہیں کچھ تو رحم آنا چاہیے۔ آج دودھ مٹھائی بند کر دو تو گھر میں رہنا مشکل ہو جائے۔

تیسرا پہر تھا۔ طاہر علی برآمدہ میں اداس بیٹھے ہوئے تھے۔ یکا یک بھیرو آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''کیوں منشی جی کیا سچ مچ اب یہاں کارکھانہ نہ بنے گا؟''

طاہر: بنے گا کیوں نہیں۔ فی الحال ملتوی ہو گیا ہے۔

بھیرو: مجھے تو بڑی آسا (آس) تھی کہ کارکھانہ بن گیا تو میرا بکری بنا بھی بڑھ جائے گا۔ دکان پر بکری بالکل مندی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں سبیرے (صبح) تھوڑی دیر بیٹھا کروں۔ آپ منجور کر لیں تو اچھا ہو۔ میری تھوڑی بہت بکری ہو جائے گی۔ آپ کو بھی پان کھانے کے لیے کچھ نجر کر دیا کروں گا۔

کسی اور وقت پر تو طاہر علی نے بھیرو کو ڈانٹ بتلائی ہوتی۔ تاڑی کی دکان کھولنے کی اجازت دینا ان کے مذہب کے خلاف تھا۔ مگر اس وقت روپیہ کی فکر نے انہیں کشمکش میں ڈال دیا۔ اس سے پیشتر بھی روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے اصول اور عمل میں کئی بار کشمکش پیدا ہو چکی تھی اور ہر موقع پر انہیں اصول ہی کا خون کرنا پڑا تھا۔ آج پھر وہی کشمکش رونما ہوئی اور اصول نے پھر حالات موجودہ کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ وہ سوچنے لگے۔ کیا کروں؟ اس میں میرا کیا قصور۔ میں کسی صرف بے جا کے لیے شرع کے خلاف عمل نہیں کر رہا ہوں۔ حالات نے مجھے بالکل مجبور کر دیا ہے۔ یہ سوچ کر کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ ''یہاں تاڑی کی بکری نہ ہو گی۔''

بھیرو: ہجور۔ بکری تو تاڑی کی مہک سے ہو گی۔ نسہ باجوں (نشہ بازوں) کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ نہ دیکھیں تو چاہے برسوں نہ پئیں، پر نسہ سامنے دیکھ کر ان سے نہیں رہا جاتا۔

طاہر: تو صاحب کے حکم کے بغیر میں کیسے اجازت دے سکتا ہوں۔

بھیرو: آپ کی جیسی مرجی۔ میری سمجھ میں تو صاحب سے پوچھنے کی جرورت (ضرورت) ہی نہیں۔ سیر ے ایک گھڑا لاؤں گا۔ گھڑی بھر میں بیچ کر اپنی راہ لوں گا۔ انہیں خبر ہی نہ ہوگی کہ یہاں کوئی تاڑی بیچتا ہے۔

طاہر: نمک حرامی سکھاتے ہو۔ کیوں؟

بھیرو: سرکار۔ اس میں نمک حرامی کا ہے کی؟ اپنے دانو گھات پر کون نہیں لیتا۔ سودا پٹ گیا۔ بھیرو یکمشت پندرہ روپے دینے پر راضی ہوگیا۔ جا کر سوبھاگی سے بولا۔ دیکھ سودا کر آیا نا۔ تو کہتی تھی کہ وہ کبھی نہ مانیں گے۔ مسلمان ہیں۔ ان کے یہاں تاڑی سراب منع ہے۔ پر میں نے تو کہہ نہ دیا تھا کہ مسلمان ہو چاہے برہمن ہو، پر دھرم کرم کسی میں نہیں رہ گیا۔ روپے پر سبھی لپک پڑتے ہیں۔ یہ میاں لوگ باہر سے اجلے کپڑے پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ گھر میں بھونی بھانگ نہیں ہوتی۔ میاں نے پہلے تو دکھانے کے لیے ادھر ادھر کیا پھر پندرہ روپیہ میں راجی ہو گئے۔ پندرہ روپے تو پندرہ دن میں سیدھے ہو جائیں گے۔"

سوبھاگی پہلے گھر کی مالکن بننا چاہتی تھی۔ اس لیے ہر روز ڈنڈے کھاتی تھی۔ اب وہ گھر بھر کی خادمہ بن کر مالکن بنی ہوئی ہے۔ روپے پیسے اسی کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ ساس جو اس کی صورت سے بیزار تھی، دن میں سو سو بار اسے دعائیں دیتی ہے۔ سوبھاگی نے فوراً روپے نکال کر بھیرو کو دیئے۔ شاید دو بچھڑے ہوئے دوست اس طرح ٹوٹ کر گلے نہ ملتے ہوں گے جیسے طاہر علی ان روپیوں پر ٹوٹے۔ رقم قلیل تھی اس کے لیے انہیں اپنے ایمان کا خون کرنا پڑا تھا۔ قرض والے اپنے اپنے روپے لے گئے۔ طاہر علی کے سر کا بوجھ ہلکا ہوا مگر انہیں بہت رات تک نیند نہ آئی۔ ضمیر سخت جان ہوا کرتا ہے۔ اس کا گلا کٹ جائے مگر جان نہیں نکلتی۔

(23)

جب تک سور داس شہر میں حکام کے ظلم کی دوہائی دیتا رہا، اس کے محلّہ والے جان

سیوک کے ہواخواہ ہونے کے باوجود بھی اس سے ہمدردی کرتے رہے۔ کمزوروں کے ساتھ ہمدردی قدرتاً پیدا ہو جاتی ہے، لیکن سورداس کی فتح ہوتے ہی اس ہمدردی نے حسد کی شکل اختیار کر لی۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ سورداس دل میں ہم لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہوگا۔ کہتا ہوگا کہ جب میں نے راجہ مہیند رکمار سنگھ جیسوں کو نیچا دکھا دیا، ان کا غرور خاک میں ملا دیا، تو یہ لوگ کس باغ کی مولی ہیں۔ سارا محلّہ اس سے دل ہی دل میں خار کھانے لگا۔ صرف ایک ٹھاکر دین تھا جو اس کے پاس اب بھی آیا جایا کرتا تھا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ سورداس کو کسی دیوتا کا اشٹ ضرور ہے۔ اس نے ضرور کوئی منتر جگا لیا ہے ورنہ اس کی اتنی کہاں مجال کہ ایسے ایسے بڑے آدمیوں کا سر جھکا دیتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جنتر منتر سب ڈھکوسلا ہے۔ یہ سب دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔

سورداس کے مزاج میں بھی اب کچھ تغیر ہوا۔ متحمل وہ پہلے ہی سے تھا، لیکن حق و انصاف کی حمایت میں اسے کبھی کبھی غصہ آ جاتا تھا۔ اب اس میں حرارت کا نام بھی نہ رہا۔ گویا کوئی گھورا تھا جس پر سبھی کوڑا پھینکتے ہیں۔ محلّہ والے راہ چلتے اسے چھیڑتے۔ اس پر آوازے کستے۔ طعنے مار دیتے۔ پر وہ کسی کو جواب نہ دیتا۔ سر جھکائے بھیک مانگتے جاتا اور پھر چپکے سے آ کر اپنی جھونپڑی میں پڑ رہتا۔ ہاں مٹھوا کا مزاج نہ ملتا تھا۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ کہتا۔ یہ کوئی نہ سمجھے کہ اندھا بھیک مانگتا ہے۔ اندھا تو بڑے بڑوں کی پیٹھ میں دھول لگا دیتا ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کو چھیڑتا۔ بھلے آدمیوں سے زبان لڑاتا۔ اپنے ہمجولیوں سے کہتا کہ چاہوں تو سارے محلّہ کو بندھوا دوں۔ کسانوں کے کھیتوں سے دھڑک چنے، مٹر، مولی، گاجر اکھاڑ لاتا۔ اگر کوئی ٹوکتا تو اس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا۔ سورداس کو روز اولہنے ملتے۔ وہ تنہائی میں مٹھوا کو سمجھاتا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ستم تو یہ تھا کہ سورداس کے انکسار و تحمل پر تو کسی کی نگاہ نہ جاتی تھی، مٹھوا کی لن ترانیوں اور شرارتوں پر سبھی کی

نگاہیں پڑتی تھیں۔لوگ یہاں تک کہہ جاتے تھے کہ سورداس ہی نے اس کو سر چڑھا لیا ہے۔بچھڑا کھونٹے ہی کے بل پر کودتا ہے۔حسد طفلانہ حرکتوں کو بھی مغالطہ بازی سمجھتا ہے۔

آج کل صوفیہ مسٹر کلارک کے ساتھ سورداس سے اکثر ملا کرتی تھی۔وہ روزانہ اس کو کچھ نہ کچھ دیتی اور اس کی دل جوئی کرتی۔پوچھتی محلّہ والے یا راجہ صاحب کے آدمی تمہیں دق تو نہیں کر رہے ہیں؟سورداس جواب دیتا مجھ پر سب لوگ دیا کرتے ہیں۔مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔محلّہ والے سمجھتے تھے کہ یہ بڑے صاحب سے ہم لوگوں کی شکایت کرتا ہے۔کنایتاً وطنزاً اسی قسم کے خیالات کا بھی اظہار کرتے۔ ''سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا'' یا ''پیادے سے فرزیں بھیو ٹیڑھو ٹیڑھو جائے۔'' ایک بار کسی سرکہ کی علت میں نایک رام کے گھر کی تلاشی ہوئی۔نایک رام کو شک ہوا کہ سورداس ہی نے نیش زنی کی ہے۔اسی طرح ایک بار بھیرو سے آبکاری کے داروغہ نے جواب طلب کیا۔بھیرو نے شاید قاعدہ کے خلاف نصف شب تک دکان کھلی رکھی تھی۔بھیرو کا شک بھی سورداس ہی پر ہوا کہ اسی نے یہ چنگاری چھوڑی ہے۔ان لوگوں کی بدگمانیوں سے تو سورداس کو زیادہ ملال نہ ہوا لیکن جب سوبھاگی کھلم کھلا اسے مطعون و بدنام کرنے لگی تو اس کو بہت رنج ہوا۔اسے یقین تھا کہ کم سے کم سوبھاگی کو میری نیت کا حال معلوم ہے۔اسے مجھ کو ان لوگوں کے دست ستم سے بچانا چاہیے تھا مگر اس کا دل بھی مجھ سے پھر گیا۔

اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ایک رات کو سورداس کھاپی کر لیٹا ہوا تھا کہ کسی نے آ کر چپکے سے اس کا ہاتھ پکڑا۔سورداس چونکا۔پر سوبھاگی کی آواز پہچان کر بولا۔ ''کیا کہتی ہے؟''

سوبھاگی: کچھ نہیں ذرا منڈیا میں چلو تم سے کچھ کہنا ہے۔

سورداس اٹھا اور سوبھاگی کے ساتھ جھونپڑے میں آ کر بولا۔''کہہ کیا کہتی ہے؟

اب تو تجھے بھی مجھ سے بیر ہو گیا ہے۔ گالیاں دیتی پھرتی ہے۔ چاروں طرف بدنام کر رہی ہے۔ بتلا میں نے تیرے ساتھ کون سی برائی کی تھی کہ تو نے میری برائی پر کمر باندھ لی۔ اور لوگ مجھے بھلا برا کہتے ہیں مجھے رنج نہیں ہوتا لیکن جب تجھے طعنے دیتے سنتا ہوں تو مجھے رونا آتا ہے۔ کلیجے میں درد سا ہونے لگتا ہے۔ جس دن بھیرو کی طلبی ہوئی تھی تو نے مجھ کو کتنا کوسا تھا۔ سچ بتا کیا تجھے بھی شک ہوا تھا کہ میں نے دروگا جی سے سکایت کی ہے؟ کیا تو مجھے اتنا نیچ سمجھتی ہے؟ بتا۔''

سو بھاگی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''میں تمہارا جتنا آدر کرتی ہوں اتنا اور کسی کا نہیں۔ تم اگر دیوتا ہوتے تو بھی میں اتنی سردھا سے تمہاری پوجا نہ کرتی۔''

سورداس: میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں۔ صاحب سے کس کی سکایت کرتا ہوں۔ جب دھرتی نکل گئی تھی تب تو لوگ مجھ سے نہ چڑتے تھے۔ اب دھرتی چھوٹ جانے سے کیوں سب کے سب میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ بتا میں کیا گھمنڈ کرتا ہوں۔ میری دھرتی چھوٹ گئی ہے تو کوئی راج گیا ہے کہ گھمنڈ کروں گا۔

سو بھاگی: میرے من کا حال بھگوان جانتے ہوں گے۔

سورداس: تو مجھے کیوں جلایا کرتی ہے؟

سو بھاگی: اس لیے۔

یہ کہہ کر اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی سورداس کے ہاتھ میں رکھ دی۔ پوٹلی بھاری تھی۔ سورداس نے اسے ٹٹولا اور پہچان گیا۔ وہ اسی کی پوٹلی تھی جو چوری ہو گئی تھی۔ اندازہ سے معلوم ہوا کہ روپے بھی اتنے ہی ہیں۔ تعجب سے بولا۔ ''یہ کہاں سے ملی؟''

سو بھاگی: تمہاری محنت کی کمائی ہے۔ تمہارے پاس آ گئی۔ اب جتن سے رکھنا۔

سورداس: میں نہ رکھوں گا۔ اسے لے جا۔

سو بھاگی: کیوں؟ اپنی پیچ (چیز) لینے میں کوئی ہرج ہے؟

سورداس: یہ میری پیچ نہیں بھیرو کی پیچ ہے۔اس کے لیے بھیرو نے اپنی آتما بیچی ہے۔مہنگا سودا لیا ہے۔ میں اسے کیسے لوں؟

سوبھاگی: میں یہ سب باتیں نہیں جانتی۔تمہاری پیچ ہے تمہیں لینی پڑے گی۔اس کے لیے میں نے اپنے گھر والوں سے چھل کیا ہے۔اتنے دنوں سے اسی کے لیے مایا رچے رہی ہوں۔تم نہ لوگے تو اسے کیا کروں گی؟

سورداس: بھیرو کو معلوم ہو گیا تو تمہیں جیتا نہ چھوڑے گا۔

سوبھاگی: انہیں نہ معلوم ہونے پائے گا۔میں نے اس کی تدبیر سوچ لی ہے۔

یہ کہہ کر سوبھاگی چلی گئی۔سورداس کو زیادہ بحث کرنے کا موقع نہ ملا۔بڑی پس و پیش میں پڑ گیا۔یہ روپے لوں یا کیا کروں؟ یہ تھیلی میری ہے یا نہیں؟ اگر بھیرو نے اسے خرچ کر دیا ہوتا تو؟ کیا چور کے گھر میں چوری کرنا پاپ نہیں ہے؟ کیا میں اپنے روپے کے بدلے اس کے روپے لے سکتا ہوں؟ سوبھاگی مجھ پر کتنی دیا کرتی ہے۔ وہ اسی لیے مجھے طعنے دیا کرتی تھی کہ یہ بھید نہ کھلنے پائے۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں پڑا ہوا تھا کہ دفعتاً ''چور چور'' کا شور سنائی دیا۔پہلی ہی نیند تھی۔لوگ غافل سو رہے تھے۔پھر آواز آئی۔''چور! چور!''

بھیرو کی آواز تھی۔سورداس سمجھ گیا کہ سوبھاگی نے یہ لیلا رچی ہے۔اپنے دروازہ پر پڑا رہا۔اتنے میں بجرنگی کی آواز سنائی دی۔''کدھر گیا، کدھر گیا؟'' یہ کہہ کر وہ لاٹھی لیے اندھیرے میں ایک طرف دوڑا۔نایک رام بھی گھر سے نکلے اور ''کدھر کدھر'' کرتے ہوئے دوڑے۔راستہ میں بجرنگی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔دونوں نے ایک دوسرے کو چور سمجھا۔دونوں نے وار کیا اور دونوں چوٹ کھا کر گر پڑے۔ذرا دیر میں بہت سے آدمی جمع ہو گئے۔ٹھاکر دین نے پوچھا۔کیا کیا لے گیا؟ اچھی طرح دیکھ لینا کہیں چھت میں نہ چمٹا ہوا ہو۔چور دیوار سے ایسا چمٹ جاتے ہیں کہ دکھائی نہیں دیتے۔''

سو بھاگی: ہائے میں لٹ گئی۔ ابھی تو بیٹھی بیٹھی اماں کا پاؤں دبا رہی تھی۔ اتنے میں جانے موا کہاں سے آ پہنچا؟

بھیرو: (چراغ سے دیکھ کر) ساری جمع جتھا لٹ گئی۔ ہائے رام!

سو بھاگی: ہائے میں نے اس کی پرچھائیں دیکھی تو سمجھی کہ یہی ہوں گے۔ جب اس نے صندوق پر ہاتھ بڑھایا تو سمجھی کہ یہی ہوں گے۔

ٹھاکر دین: کھپریل پر چڑھ کر آیا ہوگا؟ میرے یہاں جو چوری ہوئی تھی، اس میں بھی کھپریل ہی سے چڑھ کر آئے تھے۔

اتنے میں بجرنگی آیا۔ سر سے خون بہہ رہا تھا۔ بولا۔ ''میں نے اسے بھاگتے دیکھا۔ لاٹھی چلائی۔ اس نے بھی وار کیا۔ میں چکر کھا کر گر پڑا پر اس پر بھی ایسا ہاتھ پڑا کہ سر کھل گیا ہوگا۔''

یکا یک نایک رام ''ہائے ہائے'' کرتے ہوئے آئے اور زمین پر گر پڑے۔ سارا جسم خون سے لت پت تھا۔

ٹھاکر دین: پنڈا جی! کیا تم سے بھی اس کا سامنا ہو گیا کیا؟

نایک رام کی نگاہ بجرنگی کی طرف گئی۔ بجرنگی نے نایک رام کی طرف دیکھا۔ نایک رام نے دل میں کہا پانی کا دودھ بنا کر بیچتے ہو۔ اب یہ ڈھنگ نکالا ہے۔ بجرنگی نے دل میں کہا۔ جاتریوں کو لوٹتے ہو اب محلّہ والوں ہی پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔

نایک رام: ہاں بھئی۔ یہیں گلی میں تو ملا۔ بڑا بھاری جوان تھا۔

ٹھاکر دین: تبھی تو اکیلے دو آدمیوں کو گھائل کر دیا۔ میرے گھر میں جو چور بیٹھے تھے وہ سب دیو معلوم ہوتے تھے۔ ایسے ڈیل ڈول کے تو آدمی ہی نہیں دیکھے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے اوپر ان کا بھرپور ہاتھ پڑا۔

نایک رام: ہاتھ میرا بھی بھرپور پڑا۔ میں نے اسے گرتے دیکھا۔ سر جرور

(ضرور) پھٹ گیا ہوگا۔ جب تک پکڑوں نکل گیا۔

بجرنگی: ہاتھ تو میرا ایسا پڑا کہ بچہ کو چھٹی کا دودھ یاد آ گیا ہوگا۔ چاروں شانے چت گرا تھا۔

ٹھاکر دین: کسی جانے ہوئے آدمی کا کام ہے۔ گھر کے بھیدیا بنا کبھی چوری نہیں ہوتی۔ میرے یہاں بھی سبوں نے میری چھوٹی لڑکی کو مٹھائی دے کر گھر کا سارا بھید پوچھ لیا تھا۔

بجرنگی: تھانہ میں جرور رپٹ کرنا۔

بھیرو: رپٹ کر کے تھوڑے ہی رہ جاؤں گا۔ بچہ سے چکی نہ پسواؤں تو کہنا۔ چاہے بک جاؤں، پر انہیں بھی پیش ڈالوں گا۔ مجھے سب معلوم ہے۔

ٹھاکر دین: مال کا مال لے گیا۔ دو آدمیوں کو پھٹیل کر گیا۔ اس سے میں چوروں کی نگیچ (نزدیک) نہ گیا تھا دور سے لینا لینا کرتا رہا۔ جان سلامت رہے تو مال پھر آ جاتا ہے۔

بھیرو کو بجرنگی پر شبہ تھا نہ نایک رام پر۔ اسے جگدھر پر شبہ تھا۔ شبہ بھی نہیں یقین تھا۔ جگدھر کے سوا کسی کو نہ معلوم تھا کہ روپے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔ جگدھر لٹھیت بھی اچھا تھا۔ وہ پڑوسی ہو کر بھی موقع واردات پر سب سے پیچھے پہنچا تھا۔ یہ سارے وجوہ اس کے شبہ کو مضبوط بناتے تھے۔

یہاں سے لوگ چلے تو راستہ میں باتیں ہونے لگیں۔ ٹھاکر دین نے کہا۔ ''کچھ اپنی کمائی کے روپے تو تھے نہیں وہی سور داس کے روپے تھے۔''

نایک رام: پرایا مال اپنے گھر میں آ کر اپنا ہو جاتا ہے۔

ٹھاکر دین: پاپ کا ڈنڈ جرور بھوگنا پڑتا ہے۔ چاہے جلدی ہو، چاہے دیر۔

بجرنگی: تمہارے چوروں کو کچھ ڈنڈ نہ ملا۔

ٹھاکر دین: مجھے کون کسی دیوتا کا ایشٹ تھا۔ سور داس کو ایشٹ ہے۔ اس کی ایک